نہ بیان کرنے والے سمجھتے ہیں، نہ ان کے سامنے سر دُھننے والے! وہ خود بھی مغالطے میں مبتلا رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی غلط فہمیوں میں مبتلا کرتے ہیں۔

ان خاص نظائر میں سے چند اہم ترین مثالیں یہ ہیں :-

اوّل: عیاض بن غنم (عاملِ مصر) کے متعلق حضرت عمرؓ کو شکایت پہنچی کہ وہ لباس فاخرہ پہنتے ہیں اور دروازے پر دربان رکھتے ہیں، چنانچہ ان کو پکڑ بلوایا گیا اور سخت تنبیہ کی گئی تا آنکہ وہ معافی مانگ کر منصب پر بحال کئے گئے۔

دوم: حضرت ابو موسیٰ اشعری کے متعلق شکایات موصول ہوئیں کہ ان کی ایک لونڈی کو وہ غذا ملتی ہے جو عام مسلمانوں کو نصیب نہیں، تو ثبوتِ الزام پر لونڈی ان سے الگ کرادی گئی۔

سوم: کوفہ میں سعد بن ابی وقاص نے اپنے لئے ایک عالی شان محل بنوایا جس کے آگے ڈیوڑھی تھی چنانچہ تحقیقات کے بعد محمد بن مسلم کو حکومت نے مامور کیا کہ وہ اس ڈیوڑھی کو آگ لگا دیں۔

چہارم: حضرت خالد بن ولید نے رومیوں کو فتح کر کے بہت سا مالِ غنیمت پایا تو اس میں سے اشعث بن قیس (شاعر) کو دس ہزار روپیہ انعام دیا۔ حضرت عمرؓ نے معاملے کی تحقیق کے بعد خالدؓ کے ذاتی مال میں سے یہ روپیہ ضبط کر کے بیت المال میں داخل کر دیا۔

ان واقعات کو تاریخ کے اوراق میں پاکر مارکسیت کے علمبرداروں کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور فرطِ مسرت میں وہ ان کی خاص نوعیت کا جائزہ بھی نہیں لے پاتے بلکہ فوراً زبان و قلم سے یہ طوفان اٹھا دیتے ہیں کہ خلافتِ راشدہ میں انفرادی ملک کو قومی مفاد پر قربان کرنے کا طریقہ عام طور پر رائج رہا ہے۔

یہ سب کچھ سطحی معلومات کا کرشمہ ہے!

یہ سارے واقعاتی نظائر دراصل اسلامی حکومت کے افسروں اور ملازموں سے متعلق ہیں۔ ان افسروں اور ملازموں کے معاملات کو اسلامی حکومت کے "ضابطۂ خدماتِ عامہ" (PUBLIC SERVICE CODE) اور قواعدِ ملازمت (SERVICE CONDUCT RULES) کے تحت دیکھا جاتا تھا۔ ان ضوابط و قواعد کی رو سے اسلامی حکومت کے افسروں اور ملازمین کی پوری زندگی (سرکاری اور نجی) پر نگرانی قائم رکھی جاتی تھی، اور اس کا لحاظ کیا جاتا تھا کہ

جن شرائط پر ان سے معاملہ طے ہوا تھا وہ ان کو پورا کرتے ہیں یا نہیں ؟

ان ضوابط و قواعد کی رو سے خلافتِ راشدہ کا ہر سرکاری کارکن اس بات کا پابند تھا کہ وہ سادہ زندگی بسر کرے گا، ٹھاٹھ باٹھ کے مظاہرے سے پرہیز رکھے گا، عام لوگوں سے ربط رکھے گا اور ان کو شکایات و مطالبات پیش کرنے کے لئے پوری سہولتیں دے گا، نیز نہ ریاست کے اموال کو بے جا طور پر صرف کرے گا اور نہ ذاتی اموال سے سوسائٹی میں ایسے نمونے قائم کرے گا، جن سے پوری پبلک میں مفاسد پھیل سکتے ہوں۔

مندرجہ بالا واقعات میں سے ہر ایک ایسا تھا کہ اس قسم کی حدود و شرائط میں سے کوئی نہ کوئی ٹوٹتی تھی، اسی کو قائم کرنے کے لئے متعلقہ کارکنوں کے خلاف ضابطے کی کارروائی کی گئی۔

یہ واقعات اگر عام شہریوں کے متعلق ہوتے اور کسی عدالتی قانون اور عدالتی کارروائی یا کم سے کم انتظامیہ (EXECUTIVE) کی طرف سے ان کی املاک میں تصرفات کئے گئے ہوتے تو پھر معاملہ قابلِ غور تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ حکومت کے افسران اور ملازمین پر جو خاص پابندیاں عائد تھیں (اور دُنیا کی ہر حکومت اپنے کارکنوں پر کچھ پابندیاں عائد کرتی ہے) ان سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ شہریوں کے عام بنیادی حقوق تک میں قطع و برید کی جا سکتی ہے۔ اس قسم کے الٹے سیدھے استدلال کر کے جو لوگ اپنی اسلامیت کا رعب گانٹھنا چاہتے ہیں، حقیقتِ حال پر نگاہ ڈالتے ہی ان کی جہالت کا سارا راز فاش ہو جاتا ہے۔

ایسے ہی کہا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز (جن کی حکومت خلافتِ راشدہ ہی کا ضمیمہ قرار پاتی ہے) نے شاہی خاندان کے افراد اور دوسرے درباریوں اور امراء سے بھی آخر جاگیریں سلب کی ہی تھیں، حالانکہ وہ ان کی ذاتی مِلک بنادی گئی تھیں، تو پھر اسی طرح آج کوئی حاکمِ عادل اٹھے اور وہ لوگوں کے املاک کو ان کے قبضے سے نکال لے تو ایسا کرنا ناجائز کیوں ہونے لگا ؟

یہاں پھر ایک نظیر کی نوعیت سمجھے بغیر فتویٰ دیا جا رہا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دراصل جو اصلاحی مہم شروع کی تھی وہ اموالِ مغصوبہ کی واپسی کی مہم تھی۔ آپ نے ایک طرف بیت المال کو وہ املاک (زمینیں، سازوسامان، نقدی، جواہرات وغیرہ) واپس دلوائیں جو ناجائز مقاصد کے لئے، ناجائز مقداروں میں ناجائز طریقوں سے دی اور دلوائی گئی تھیں، اور دوسری طرف عام شہریوں

(مسلمانوں اور ذمیوں، دونوں) کو ان کی املاک (زمینیں، ساز و سامان وغیرہ) ان لوگوں کے قبضے سے نکال کر واپس کرائیں جن کو سابق حکومت نے جبراً سلب کر کے بہم پہنچائی تھیں۔

یہ دو مختلف قسم کے اموال تھے۔ ایک حکومت کے املاک جو ناجائز طور پر کسی کے شخصی قبضے میں دیئے گئے تھے اور دوسرے شہریوں کے املاک جو حکومت نے دوسرے شہریوں کو جبراً دلوا دیئے تھے۔ یہ سب کے سب بیت المال میں داخل کر کے قومی ملکیت نہیں بنا دیئے گئے تھے، بلکہ جو جس چیز کا حقدار تھا وہ اسی کو دلوائی گئی تھی۔

پھر یہ ساری اصلاحی مہم باضابطہ آئینی کارروائی کر کے سرانجام دی گئی تھی اور ایک ایک معاملے پر الگ الگ غور کیا گیا تھا۔

اس نظریے سے تو یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اگر ایک حکومت نے پبلک خزانے کے املاک کو ناجائز طور پر افراد کے حوالے کر دیا ہو، یا بعض افراد سے چھین کر کوئی مال بعض افراد کو بلا کسی قانونی حق کے دلوا دیا ہو تو بعد کی صالح حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر معاملے کی تحقیق کر کے حقداروں کو ان کا حق پہنچا دے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلا کہ افراد سے جو کچھ چاہو چھین کر اسے قومی ملکیت کے باڑے میں داخل کر دو!

یہ ہیں وہ نظائر جن سے عام طور پر ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جاتی ہے، لیکن اس کی حقیقت پر ذرا سا غور کرتے ہی اس استدلال کی قلعی کھل جاتی ہے جس پر قومی ملکیت کے "اسلامی" فلسفے کا دارو مدار ہے!

سرمایہ داری اور اسلام کے نظامِ ملکیت میں فرق

جب ہر طرف سے قومی ملکیت کے مسلم مبلغوں کو دلائل گھیر کر یہاں لے آتے ہیں کہ اسلام میں انفرادی ملکیت کا حق شہریوں کے بنیادی حقوق میں داخل ہے اور یہاں نہ قومی ملکیت کے اصول کی ضرورت ہے، نہ اس کی جگہ ہے، تو پھر اس طنز پر بات ختم کر دی جاتی ہے کہ اگر بات یہی ہے تو اسلام اور سرمایہ داری میں فرق کیا رہا!

یہ درست ہے کہ انفرادی ملکیت کا اصول اسلام میں بھی پایا جاتا ہے اور سرمایہ داری میں بھی، لیکن کیا اتنی سی بات سے دونوں ایک ہو جائیں گے؟ اگر ایسا ہے تو کمیونزم بھی "اصولی ریاست" کا داعی ہے اور اسلام بھی! پھر کیا اسلام اور کمیونزم ایک ہو جائیں گے؟ بکری کا بھی معدہ ہوتا ہے اور اونٹ کا بھی، تو کیا

ان کو ایک سمجھا جائے گا ؟ ہرن کے بھی سینگ ہوتے ہیں اور بیل گائے کے بھی، تو کیا اتنی سی بات دونوں کو ایک بنا دے گی ؟ کچھ سوچئے کہ آپ حضرات کی منطق کی چولیں کہیں سے ڈھیلی تو نہیں ہیں !

آیئے، اب آپ کی خدمت میں تجزیہ کرکے واضح کیا جاتا ہے کہ اسلام کے نظام ملکیت اور سرمایہ داری کے نظام ملکیت کو کونسی چیزیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔

(۱) املاک کے حصول، تقسیم، اور ان کے استعمال کے بارے میں اسلام کے چند بنیادی اصول (FURDAMENTALS) اور چند قانونی حدود (LIMITATION) کتاب وسنت کی رو سے ہر ملک اور زمانے کے لئے واجب القبول ہیں اور ان کو بدلنے یا برطرف کرنے کا حق دستور و قانون کے لحاظ سے کسی کو حاصل نہیں ہے یہ بنیادی اصول وحدود دراصل ان بے شمار مفاسد کا دروازہ بند کرنے کے لئے ہیں جنھیں اگر کھلا چھوڑ دیا جائے تو پھر انفرادی ملکیت کا نظام انسانیت کے لئے عذاب بن جاتا ہے۔

مثلاً سود اور سٹے اور قمار کی حرمت، معصیت کو کمائی کا ذریعہ بنانے یا معصیت کے راستوں میں خرچ کرنے کی حرمت۔ یا صدقاتِ واجبہ کی ادائی اور ایک خاص نظم سے وراثت کی تقسیم وغیرہ کا لازم ہونا ! ——— وغیرہ۔

بخلاف اس کے سرمایہ دارانہ نظام میں آمد و صرف اور تبادلہ و تقسیم کے لئے کوئی اٹل اصول و قواعد نہیں ہیں کہ ہر حال میں ان کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کا بہاؤ کسی ایک متعین رودگاہ میں نہیں ہوتا بلکہ وہ افراط و تفریط کے مظاہرے کرتا ہوا بڑھتا ہے۔ اس کے خداوند آج ایک حد کو قائم کرتے ہیں تو کل اسے خود ہی توڑنے کا فیصلہ کر دیتے ہیں، اور کل جسے توڑا تھا اسے آج پھر بحال کرنے کا اہتمام کرتے نظر آتے ہیں۔

(۲) اسلام کے سارے ضابطۂ ملکیت میں اس سرے سے اس سرے تک افراد اور معاشرہ کے اخلاقی ارتقا کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے اور اصول وحدود محض معاشی فائدوں اور نقصانوں کا جائزہ لے کر نہیں مقرر کئے گئے، بلکہ اس سے زیادہ انسانیت کے اخلاقی نفع و نقصان کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

مثلاً سود بعض معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے میں خاصا مفید معلوم ہوتا ہے، اور اس کے بعض فوائد

کے پیشِ نظر سرمایہ دارانہ نظام نے اُسے قبول کیا ہے اور اس کو اصول بنا کر اس پر بنکنگ کا لمبا چوڑا نظام تعمیر کر ڈالا ہے جسے دیکھ کر آج مسلمان علماء کی آنکھیں بھی مرعوب ہو جاتی ہیں لیکن اسلام نے سود کے معاشی مفاد کے ساتھ اس کے معاشی نقصانات کو بھی دیکھا ہے، اور ان سے بھی بڑھ کر اس کے اخلاقی مفاسد کا لحاظ کیا ہے۔ اسی طرح شراب کی حرمت معاشی لحاظ سے نہیں، اخلاقی نقطۂ نظر سے عائد کی گئی ہے، حالانکہ معاشی لحاظ سے شراب بنا بنا کر غیر ملکوں کے ہاتھ بیچنا بہت نفع دے سکتا ہے۔

اسلام کے اس مزاج کے پیشِ نظر ایک صحیح اسلامی حکومت اپنی مختلف پہلوؤں کے ساتھ معاشیات میں بھی اپنی قانون سازی اور اپنی پالیسی بنانے کی سرگرمیوں میں مجبور ہے کہ صرف معاشی فائدے ہی کو نہ دیکھے، بلکہ اس سے زیادہ اہمیت کے ساتھ عوام کے اخلاقی صلاح و فساد کا لحاظ کرے۔ اگر ایک طریقے سے مالی فائدہ ہوتا ہو لیکن اخلاقی نقصان بھی ساتھ آتا ہو تو وہ اسے چھوڑ دے گی اور دوسرے طریقے سے اگر وہ دیکھے گی کہ ایک مالی فائدہ ہاتھ سے جاتا ہے لیکن ملت کو عظیم الشان اخلاقی فوائد حاصل ہوتے ہیں، تو وہ اخلاقی فوائد کی طرف زیادہ مائل ہو گی۔

ایسے نظام میں جس میں انفرادیت ملکیت ایسی قانونی اور انتظامی تدابیر کے ساتھ قائم کی گئی ہو جو اس کے اندر اخلاقی روح کو بیدار رکھیں اور معاشرت میں اسے مفاسد پیدا کرنے کا موقع نہ دیں، سرمایہ داری سے بالکل مختلف نوعیت کا ہو گا۔

سرمایہ دارانہ ریاست میں تو انفرادی ملکیت کے نظام کو ایسے قانون اور ایسی پالیسی کے ذریعے قائم رکھا جاتا ہے جس میں انسانیت کی اخلاقی فلاح کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ قابلِ لحاظ صرف مادی مفاد، مالی ترقی، ذرائع پیداوار کی افزائش وغیرہ قسم کے مقاصد ہوتے ہیں۔ اخلاق صرف وہی قبول کیا جاتا ہے اور اسی حد تک جس کا یہ مقاصد تقاضا کریں، ورنہ تعمیرِ اخلاق کی بجائے خود کوئی مقصدی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔

اب جب "انفرادی ملکیت" کو ایک غیر اخلاقی فضا مل جاتی ہے تو وہ خوب پاؤں پھیلاتی ہے۔ اسے اخلاق کا کوئی سنتری کسی طرف بڑھنے سے نہیں روکتا، اسے کسی چوراہے پر ٹریفک کو کنٹرول کرنے والا کوئی

اصول نہیں ٹوٹتا۔ پس اصل فساد مادہ پرستانہ فضا کی وجہ سے ہوتا ہے نہ کہ انفرادی ملکیت کی وجہ سے ـــــــ اور اسلام میں اس طرح کی فضا قابلِ برداشت نہیں ہے۔ اس فضا کو بھی اگر انفرادی ملکیت کے ساتھ اسلام میں اٹھا لایا جائے تو پھر وہ بھی یقیناً سرمایہ داری بن جائے گا۔

سرمایہ دارانہ نظام ایسی خدا پرستانہ ذہنیت اور خدمت پسند سیرت انسانوں کے اندر تعمیر کرنے کی بھاری ذمے داری اپنے سر نہیں لیتا جو ان کو جانور اور درندے بننے سے بچائے۔ اس قسم کا کوئی پروگرام اس کے پاس نہیں ہے، بلکہ اپنی اس کوتاہی پر شرمندہ ہونے کے بجائے اس نے ارتقا کا وہ فلسفہ قبول کیا ہے جو طاقت کو حق قرار دے کر اور اخلاق کا محور فائدے کو مقرر کر کے انتہائی فاسد ذہنیتیں اور سیرتیں بہم پہنچا رہا ہے۔

دوسری طرف اسلام حکومت پر واجب ٹھیراتا ہے کہ وہ خدا کی بندگی اور آخرت کی جوابدہی کے عقائد کا گہرا نقش عوام میں بٹھائے، ان کو اخلاق پرور عبادات کا پابند بنائے، ان میں بھلائیوں میں تعاون اور برائیوں کی مدافعت کا جذبہ ابھارے، ان میں اخوت اور مساوات کی حس بیدار کرے، ان میں ایک صالح جماعتی نظم کو ترقی پذیر بنائے، ان میں باہمی تعاون کی روح پھونکے، ان میں پوری نوع انسانی کو حق کی تعلیم دینے، مفاسد سے بچانے، اور مظالم سے نجات دلانے کو ایک اعلیٰ نصب العین بنا کر ساری قوتیں اس پر صرف کرنے کا جذبہ ابھارے۔

اس طرح سے تیار کی ہوئی سوسائٹی میں انفرادی ملکیت جب پرورش پاتی ہے تو وہ بالکل دوسری ہی قسم کے برگ و بار لاتی ہے۔ پھر اس میں پھل پھول تو نکلتے ہیں کانٹے نہیں نکلتے۔

(۳) سرمایہ دارانہ نظام میں انفرادی ملکیت کے تحت مادہ پرستانہ ذہنیتیں جب طبقاتی کشمکش کی بنا ڈالتی ہیں تو اسٹیٹ اس کشمکش میں بڑی حد تک غیر جانبدار رہتی ہے اور اسے روکنے یا صحیح راستے پر ڈالنے اور کسی نتیجہ خیز پہنچانے کے لیے کوئی پارٹ ادا نہیں کرتی۔ ظالم و مظلوم میں تعاون پیدا کرنے کی کوئی تدابیر اس کے پاس نہیں ہوتیں۔ وہ اگر اس کشمکش میں مداخلت کرتی بھی ہے تو سرمایہ دار طبقہ کے سیاسی تسلط کی وجہ سے ہمیشہ اپنا وزن ظالم عناصر کے پلڑے میں ڈالتی ہے، اور مظلوموں کا کوئی حق وہ اسی وقت مانتی ہے جب اسے یہ محسوس ہو جائے کہ اس کے سوا چارہ کار کوئی اور ہے ہی نہیں۔

بخلاف اس کے اسلام کے نظام میں، اول تو انفرادی ملکیت طبقاتی کشمکش برپا کرنے کے لئے کبھی سازگار حالات نہیں پاسکتی، اور اگر ایسا ہو جائے تو حکومت کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ وہ کشمکش کو تعاون سے بدلے۔ اس کے لئے جہاں غیر جانبدار تماشائی بن کر پڑے رہنا ایسی حالت میں ممکن نہیں ہوسکتا، یہ بھی ناقابلِ تصور ہے کہ وہ اپنا وزن ظالم طبقے کے پلڑے میں ڈالے۔ جیسا کہ خلفائے راشدین نے اپنے خطباتِ خلافت میں اسلامی ریاست کی پالیسی کی توضیح کرتے ہوئے اعلانات کئے تھے اور ان پر عمل کرکے دکھایا تھا۔

(۴) سرمایہ دارانہ نظام میں، انفرادی ملکیت کے کھل کھیلنے کی وجہ سے جب مسابقت میں کمزور افراد ہار کر گرجاتے ہیں تو حکومت کی ذمہ داری ان کو اٹھاکر، سنبھال کر، ہمت بندھا کر ذرائع مہیا کرکے پھر سے دوڑ لگانے کے قابل بنانے کے بارے میں اصولاً کچھ نہیں ہوتی۔ کوئی اگر بے روزگاری میں گھر گیا ہے، کوئی محنت کا معاوضہ نہیں پاسکا ہے، کسی کے ہاں فاقہ ہے، کسی کی بیوی علاج سے محروم ہے، کسی کا بچہ تعلیم حاصل کرنے کے قابل نہیں ہے تو حکومت اس قسم کے حالات پر اس وقت تک متوجہ نہیں ہوتی جب تک وہ یہ نہ محسوس کرلے کہ ان حالات سے اس کی آمدنی میں فرق آرہا ہے، یا اس کے لئے لا اینڈ آرڈر کو بحال رکھنا مشکل ہو چلا ہے، یا بین الاقوامی طور پر اس کی رسوائی ہو رہی ہے! اصولاً وہ ان حالات کے بارے میں کوئی ذمہ داری نہیں رکھتی۔

بخلاف اس کے اسلامی حکومت اپنے شہریوں کے بنیادی حقوق ہی میں اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ وہ ان کو کسی حال میں بے سہارا نہ رہنے دے گی۔ وہ اگر بے روزگاری یا فاقہ کشی میں مبتلا ہوں گے تو چاہے وہ کوئی منظم احتجاج نہ کرسکیں اور کوئی جلوس نکال کر شور و غوغا نہ مچا سکیں، اور چاہے وہ نہایت ہی قلیل تعداد میں ہوں اور ان کی کوئی آواز نہ ہو، تو بھی وہ ان کی بنیادی ضروریات بہم پہنچانے اور ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لئے انتظام کرے گی۔

اس مقصد کے لئے اس کا ایک انتظام تو یہ ہوتا ہے کہ وہ گرتوں کو سہارا دینے کی عام اسپرٹ شہریوں میں پیدا کرتی اور اسے نشوونما دیتی، اور اس مقصد کے لئے ان کی تنظیموں، اداروں اور اوقاف کی سرپرستی کرتی ہے، اور دوسری طرف وہ خود اپنے بیت المال اور خود اپنے سرکاری اداروں کی مشینری کو بھی اس مقصد کے لئے استعمال کرتی ہے۔

یہ اہتمام نظام سرمایہ داری میں نہیں ہوتا۔

مثلاً آج ——— نظام سرمایہ داری کی مادہ پرستانہ ذہنیت کے ساتھ ——— جب ایک سرمایہ دار کثیر پیداآوری کے لئے ایک مشین خریدتا ہے تو اس سے بالکل بے پرواہ ہوتا ہے کہ خود اس کے اپنے ہاں کے کتنے مزدور بے کار ہو جائیں گے یا شہر اور ملک کے دوسرے کتنے مزدوروں پر اثر پڑے گا۔ لیکن ایک صحیح اسلامی نظام اور اسلامی معاشرہ میں اصحاب سرمایہ لوگ اس ناپاک ذہنیت کے مالک نہ ہوں گے کہ دوسرے ہزاروں آدمی تباہ ہوتے ہیں تو ہوتے رہیں، ہمیں تو اپنے فائدے سے غرض ہے۔ پھر سر پر ایک حکومت اس طرز کی ذہنیت کے ساتھ نگراں ہو گی جس کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے (یہ بیان طبری کا ہے) کرائے کے گھوڑوں کا ایک بڑا اصطبل مدینہ میں قائم کرنے والے ایک کاروباری کو اس شرط پر اس کی اجازت دی تھی کہ ان گھوڑوں کے لئے چارہ مدینہ کی حدود سے باہر سے آئے گا تاکہ یہاں کے مویشیوں کے لئے چارے کی قیمتیں نہ بڑھنے پائیں۔ وہ حکومت مشینی دور کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے ہر تبدیلی پر نظر رکھے گی کہ یہ کہاں کہاں اثر ڈالتی ہے اور کتنے آدمیوں کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ پھر وہ ان کو بے روزگاری ——— اور مشینوں کے مقابلے ——— کے خطرے سے بچانے کے لئے کوآپریٹیو سسٹم کے تحت ایسی اسکیمیں اختیار کرے گی جن میں اس کے تربیت دیئے ہوئے اہل سرمایہ رضاکارانہ طور پر تعاون کے لئے تیار ہوں گے۔ وہ سرمایہ و محنت کو ایک بڑے اور پاکیزہ نصب العین کے لئے اسی طرح جمع کرتی جائے گی جس طرح جہاد فی سبیل اللہ کے لئے بھاری اسلحہ والے دستے اور ہلکے اسلحہ والے دستے، اور ہوا باز اور سفر مینا ——ب کے سب ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

میرے ایک دوست خوب کہتے ہیں کہ اگر مشینی انقلاب نبی صلعم یا خلافتِ راشدہ کے دور میں عرب سے نمودار ہوا ہوتا تو آج دنیا کے نظام ہائے حیات کی شکل ہی دوسری ہوتی!

(۵) سرمایہ دارانہ نظام میں انفرادی ملکیت کی نشو و نما جس قانونی اور حکومتی انتظام کے تحت ہوتی ہے اس کی باگ ڈور ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھ میں رہتی ہے جو سرمایہ دار طبقے کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس نظام میں "انتخابات" کسی اخلاقی معیار پر نہیں ہوتے بلکہ ان پر "روپے کا زور" پورا پورا تسلط رکھتا ہے لیکن اسلام میں صالحیت و تقویٰ کے معیار قرار پانے اور "امیدواری" کے ممنوع ہونے کی وجہ سے بالکل دوسری

قسم کے لوگ آگے آتے ہیں جو کسی ایک طبقے کے نہیں بلکہ جملہ شہریوں کے، پوری ملت کے، اور خود دینِ حق کے مخلص نمائندے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں جو قانون و نظم وجود پاتا ہے وہ انفرادی ملکیت کو اس نہج پر پروان نہیں چڑھاتا جس نہج پر سرمایہ دارانہ نظام میں اس کی نشوونما ہوتی ہے۔

یہ پانچ بنیادی اختلافات ہیں جن کی وجہ سے اسلام اور سرمایہ داری میں انفرادی ملکیت کے اصول پر متفق ہونے کے باوجود مشرق و مغرب کا تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے مارکسی پروپگنڈے کا یہ کہنا کہ جب اسلام انفرادی ملکیت کا داعی ہے تو اس میں اور سرمایہ داری میں فرق کیا رہا محض مغالطہ انگیزی ہے، اور کچھ نہیں!

یہ چیز دگر ہے، وہ چیز دگر!

ایک اور غلط فہمی

اسلام کے نظریۂ ملکیت پر جب کوئی ٹھوس بحث کی جاتی ہے تو بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ انفرادی ملکیت کے اسلامی اصول کو موجودہ بگڑے ہوئے معاشرہ کے احوال میں رکھ کر ہم نظامِ حاضر کا تحفظ کرنے کے لئے سارا استدلال کر رہے ہیں۔ بسا اوقات جان بوجھ کر ایسا سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے۔

ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ انفرادی ملکیت کے موجودہ سسٹم کو بجائے اس کے کہ قومی ملکیت کے مارکسی نظام میں ڈھالا جائے، بہ حیثیت مسلم ہمارا فرض یہ ہے کہ اسے اسلامی معاشرہ کے مخصوص سانچے ڈھالیں، اور جہاں ملکیت کا اسلامی ضابطہ اختیار کریں وہاں پورا نظامِ معیشت بھی اسلام کا لائیں اور اس کے مزاج کے مطابق اسلام کا سیاسی و معاشرتی نظام بھی اختیار کریں۔ ورنہ اصولِ ملکیت اسلام کا لے کر اگر اسے معیشت، معاشرت اور ریاست کے کسی ایسے نظام میں جڑا جائے جو خود غیر اسلامی ہو تو پھر نظام سرمایہ دارانہ بنے گا، نہ کہ اسلامی۔ ہم دعوت اس کی نہیں دے رہے۔

رسائل و مسائل

سوال :-

آپ نے میرے مضمون "قرآن میں چور کی سزا" پر جو اظہارِ خیال فرمایا ہے اس کے لئے شکریہ ! اب اسی قسم کا ایک اور مضمون "قرآن میں زنا کی سزا" کے عنوان سے بھیج رہا ہوں۔ میری استدعا ہے کہ آپ اس پر بھی اظہارِ خیال فرمائیں۔ اگر خدا کو منظور ہوا تو جناب کی دونوں تنقیدوں کا ایک جا جواب دوں گا۔

یہاں سرسری طور پر اس قدر گزارش کرنا ضروری ہے کہ آپ نے میری اس تشریح کے بارے میں نکتہ چینی نہیں فرمائی کہ قرآن نے جو سزا بیان کی ہے وہ زیادہ سے زیادہ سزا ہے، اور کم سے کم سزا جج کی قوتِ تمیزی پر منحصر ہے۔ اور نہ اس بارے میں کچھ فرمایا کہ دنیا میں کسی جرم کی سزا مجرم کو آخرت کی سزا سے محفوظ رکھتی ہے۔

نوٹ :- مستفسر کے محولہ بالا مضمون کے چند ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں، تاکہ ان کی روشنی میں جواب کو دیکھا جا سکے (ادارہ)

ہم اپنے سابقہ مضمون (قرآن میں چور کی سزا) میں بتلا چکے ہیں کہ سارق سے مراد سرقہ کے تمام مددگار لوگ ہیں، خواہ وہ مؤنث ہوں یا مذکر اور خود عورت اگر چور ہے تو وہ لفظِ سارق میں بھی داخل ہے اور سارقہ بھی ہے۔ یہاں بھی (آیت الزانیۃ والزانی میں) وہی کیفیت ہے۔ زانیہ میں فعلِ زنا کے تمام مددگار لوگ شامل ہیں، خواہ وہ دلال ہوں، دلالہ ہوں یا پیغام رساں ہوں، یا زانیوں کے لئے آسانیاں فراہم کرنے والے، یا زنا کے مفعول ہوں، وغیرہ وغیرہ" ——— "چور کی سزا کو بیان کرتے ہوئے "سارقہ" کو سارق کے بعد لایا گیا تھا، آخر کوئی وجہ ہونی چاہیئے کہ یہاں زانیہ کو زانی سے پہلے لایا گیا۔ ہمیں جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ چوری کے جرم میں بڑا مجرم چور ہوتا ہے اور اس کے مددگار بعد میں، مگر زنا کی صورت میں زنا کے مددگار (یعنی زانیہ) زانی سے مقدم ہیں، کیونکہ ان کی امداد اور رضامندی کے بغیر فعلِ زنا